(۹۲)

کامل ایمان کا پتہ مصیبت کے وقت ہی لگتا ہے

(فرمودہ ۱۰۔ دسمبر ۱۹۱۵ء)

تشہّد، تعوّذ اور سورۃ فاتحہ کے بعد حضور نے مندرجہ ذیل آیت کی تلاوت کی:۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ِ اطْمَاَنَّ بِهٖ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ِ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ [1]

اس کے بعد فرمایا۔

ایمان جو انسان کو خدا تعالیٰ کے انعامات کا وارث کرتا ہے اور اس کا مقرب پیارا اور نعمتوں کا جاذب بناتا ہے، وہ ایمان ہر قسم کے شکوک اور شبہات اور مَاسِوَا اللہ کی محبت سے خالی ہوتا ہے۔ وہی انسان کو کامیاب کرتا ہے اور خدا تعالیٰ کی رضامندی کا باعث ہوتا ہے لیکن وہ ایمان جس میں مَا سِوَا اللہ کی محبت کی ملاوٹ ہو وہ کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ دونوں محبتوں کا یکجا ہونا غیر ممکن ہے۔

ہمارے ہاں لوگ کہا کرتے ہیں کہ دو کشتیوں میں پاؤں رکھنے والا انسان کبھی نہیں بچ سکتا۔ اگر دونوں کشتیاں کچھ وقت تک اکٹھی بھی چلی جائیں تو پانی کی رَو ضرور ایک نہ ایک وقت ان کو علیحدہ کر دے گی اور دونوں کشتیوں میں پاؤں رکھنے والے انسان کی ٹانگیں چِر جائیں گی اور وہ غرق و تباہ ہو جائے گا۔ اسی طرح خدا تعالیٰ سے تعلق رکھنے والا اور دنیا سے محبت رکھنے والا کیونکر کامیاب ہوسکتا ہے؟ جب تک انسان کامل طور پر خدا تعالیٰ سے تعلق پَیدا نہ کرے اور دنیا کی محبت کو نہ چھوڑے کامیاب نہیں ہوسکتا۔ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ لوگ ایسے

ایمان کو لے کر خدا تعالیٰ سے ملنا چاہتے ہیں لیکن ایسے کمزور ایمان والوں کو جب خدا تعالیٰ کی طرف سے انعام یا اکرام ملتا ہے تو بس ان کا ایمان پھوٹ پھوٹ کر نکلتا ہے اور جس جگہ بیٹھتے ہیں وہیں خدا تعالیٰ کے فضلوں اور کرموں کا ذکر شروع کر دیتے ہیں اور خدا تعالیٰ کی محبت میں ایسے سرشار معلوم ہوتے ہیں کہ گویا ساری دنیا کے انعام انہی پر ہوئے ہیں اور خدا تعالیٰ کی محبت کا ان کو اس قدر اعتبار ہو جاتا ہے جس کی کوئی حد نہیں۔ اور کسی وقت ان کو کوئی تکلیف پہنچ جائے تو جھٹ شکایت شروع کر دیتے ہیں کہ خدا نے آگے ہم پر کون سا انعام کیا تھا جو اب تکلیف بھیج دی ہے۔ ایسے لوگوں کا ایمان اس ملمّع شدہ چیز کی طرح ہوتا ہے جس کا ملمع کچھ دنوں بعد اُتر جائے اور اس چیز کی اصلی حقیقت کھل جائے۔ اسی طرح جب ایسے لوگوں کو تکلیف پہنچتی ہے تو ان کا ایمان جو دنیا کی محبت میں ملوث ہوتا ہے اس ملمّع کی طرح کھل جاتا ہے اور ان کا کامل ایمان اور خدا تعالیٰ پر یقین کی جو حالت ہوتی ہے کچھ دنوں بعد کھل جاتی ہے بعض لوگوں کا ایمان کامل بھی ہوتا ہے مگر جب ابتلاء پیش آتا ہے تو ان کا ایمان بھی ڈگمگا جاتا ہے۔

درحقیقت وہ اپنے آپ کو بڑا کامل الایمان خیال کرتے ہیں مگر ابتلاء کے وقت وہ ایسے بودے نکلتے ہیں جس کی کوئی حد نہیں۔ ایسے ہی سکول کے بعض طلباء کی حالت ہوتی ہے وہ بھی اپنے آپ کو بڑا ہوشیار اور بڑا لائق سمجھتے ہیں مگر جب امتحان آتا ہے تو وہ ان کی کمزوری کو بتا دیتا ہے۔ اور آئندہ کیلئے اس لڑکے کو ہوشیار کر دیتا ہے جس کمزوری کو دیکھ کر اسے زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے۔ اسی طرح بہت سے ابتلاء انسان کو فائدہ دے جاتے اور اس کی ترقی کا باعث ہوتے ہیں۔ اس ابتلاء کے بعد ہی انسان ترقی کرتا اور کوشش میں لگتا ہے جس طرح طلباء کے ماہواری امتحان ان کو بتلا دیتے ہیں کہ تم نے اس ماہ میں کس قدر محنت کی اور اس کا کیا ثمرہ پایا۔ اسی طرح ابتلاء انسان کو بتا دیتے ہیں کہ اس کے ایمان کی کیا حالت ہے اور وہ اپنے ایمان کو ملونی سے صاف کرنے کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں لیکن وہ لوگ جو ابتلاؤں سے فائدہ نہیں اٹھاتے وہ کبھی ترقی اور کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔ اس قسم کے لوگ نہ تو دنیا میں کامیاب ہوتے ہیں اور نہ آخرت میں پس ایسے لوگ جو ابتلاء کے وقت خدا تعالیٰ سے قطع تعلق کر لیتے ہیں پھر انہیں ذلیل وخوار ہونا پڑتا ہے۔ ایسے لوگ دین میں ہو کر دین سے خارج ہی ہوتے ہیں، بظاہر وہ خدا تعالیٰ سے تعلق رکھتے، کامل ایمان اور یقین ظاہر کرتے ہیں مگر

درحقیقت ان کو خدا تعالیٰ سے ذرا بھی تعلق نہیں ہوتا۔ پھر خدا تعالیٰ ایسے دو طرفہ تعلق رکھنے والے انسانوں کو کبھی پسند نہیں کرتا اور باوجود دین سے تعلق رکھنے کے وہ کسی کامیابی کا منہ نہیں دیکھ سکتے۔ ان کے مقابلہ میں کفار جو یکطرفہ تعلق رکھنے والے ہوتے ہیں خدا تعالیٰ ان کو ترقی دیتا اور کامیاب کرتا چلا جاتا ہے۔

حضرت اقدس علیہ السلام فرمایا کرتے تھے کہ جب تُرکوں نے بغداد پر حملہ کیا تو اٹھارہ لاکھ آدمی انہوں نے قتل کئے اور ایسی تباہی مچائی جس کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ پھر فرماتے تھے کہ ایک شخص ایک ولی اللہ کے پاس آیا اور عرض کیا کہ دعا کریں کیونکہ مسلمان تباہ اور ہلاک ہو رہے ہیں اور کفار نے تمام بڑے بڑے آدمیوں کو قتل کر دیا ہے تو اس وقت اس نے کہا کہ مَیں جب آسمان کی طرف دعا کیلئے ہاتھ اُٹھاتا ہوں تو ملائکہ کی طرف سے یہ آواز آتی ہے۔ اَیُّھَا الْکُفَّارُ! اُقْتُلُوا الْفُجَّارَ ۲؎ اے کافرو۔ ان فاجروں کو مارو۔ حالانکہ ان دونوں فریقوں میں بڑا فرق تھا۔ ایک خدا کو ماننے والے تو دوسرے اس کے منکر۔ ایک رسولوں اور اس کی کتابوں کو ماننے والے مگر دوسرے اس سے متنفر۔ ایک دین کو ماننے والے اور دوسرے اس سے بیزار۔ ایک قرآن کو ماننے والے اور دوسرے اس کو مٹانے والے۔ اس میں کیا بھید ہے۔ یہی تو ہے کہ کفار گو ایسے ظاہر دشمن ہیں کہ جن کے دل میں ذرا بھی ایمان نہیں وہ تو خدا کا انکار کرتے ہیں مگر یہ باوجود ماننے کے پھر نہیں مانتے اور دین سے خارج ہیں مسلمان کہتے تو تھے کہ ہم میں ایمان ہے مگر دراصل ان میں ایمان نہ تھا۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کہتے تھے مگر پھر ناکام و نامراد تھے یہی بات تو تھی کہ ان کے ایمانوں میں دنیا کی محبت مل گئی تھی اور خدا تعالیٰ سے پورا تعلق نہیں رہا تھا اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ خالص ایمان رکھ کر خدا تعالیٰ کو نہیں پکارتے تھے بلکہ ان کا آہ وزاری کرنا کسی خاص مدعا اور مقصد کیلئے تھا وہ خدا کی عبادت کرتے تھے لیکن درحقیقت ان کی عبادت کسی خاص غرض کیلئے ہوتی تھی۔

پس مومن کو چاہیئے کہ یکطرفہ تعلق رکھے۔ اور ہر رنج، دکھ، تکلیف اور آرام میں غرض بہر حال خدا تعالیٰ سے راضی ہو۔ بہت مسلمان جب کہ ان سے کہا جاتا ہے کہ تم نماز روزہ ادا کرو تو کہہ دیتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے ہم کو دیا کیا ہے جو اتنی مشقّت میں پڑیں۔ حالانکہ وہ احمق نہیں جانتے کہ جس منہ سے وہ یہ جواب دیتے ہیں اور جس دماغ سے سوچتے ہیں وہ بھی تو خدا ہی کا دیا ہوا تو ہے جب اس کے اس قدر احسان اور انعامات ہم پر ہیں تو کیا وجہ

ہے کہ ہم اس کی شکر گزاری میں نہ لگ جائیں۔ مولانا رومیؒ نے خاص ایمان والے انسان کے متعلق ایک عجیب قصہ لکھا ہے وہ لکھتے ہیں کہ ایک شخص کے پاس لقمان بطرز غلام رہتے تھے ان کو ان سے بڑی محبت تھی اور ان سے بڑا تعلق تھا اور جو کچھ وہ کھاتا انہیں ساتھ شامل کرتا۔ ایک دفعہ بے فصل خربوزہ ان کے پاس آیا تو اس نے اس کی قاشیں کاٹ کر حضرت لقمان کو دیں تو انہوں نے اسے بڑے شوق سے کھایا پھر ایک اور دی اور اسے بھی بڑے شوق سے کھایا آخر اس شخص کو بھی یہ خیال آیا کہ بڑے ہی مزے کی یہ چیز ہوگی جسے لقمان اتنے مزے اور شوق سے کھاتا ہے۔ جب اس نے خود ایک قاش لے کر منہ میں ڈالی تو وہ نہایت تلخ تھی اس نے کہا لقمان یہ تو بڑی تلخ اور کڑوی ہے تم اسے اس مزے اور شوق سے کھا رہے ہو تو حضرت لقمان نے جواب میں کہا کہ جس کے ہاتھ سے ہزاروں میٹھی چیزیں کھائی ہیں اگر ایک دفعہ کڑوی اور تلخ کھالی تو کون سا حرج ہو گیا[۳]۔ اس شخص کے احسانات حضرت لقمان پر اتنے کیا ہوں گے لیکن انہوں نے اس کی ایسی قدر کی کہ اس کی دی ہوئی تلخ شے کو بھی میٹھا سمجھ کر کھالیا۔ پھر خدا تعالیٰ کے اس قدر احسانات کے ہوتے ہوئے بھی جن کا کوئی حساب نہیں مومن کو کس ایمان کا نمونہ دکھانا چاہئے اور اگر کبھی اس کیلئے تکلیف برداشت کرنی پڑے تو کس خوشی سے اس کو قبول کرنا چاہئے۔

پس ہر ایک انسان پر فرض ہے کہ وہ سوچتا رہے کہ مجھ میں لقمان کی روح ہے یا شیطان کی۔ اگر اس کے اندر لقمان کی روح ہے اور خدا تعالیٰ کی باتوں کو ماننے کیلئے ہر وقت تیار ہے اور کسی وقت اس کے احکام میں اپنے آپ کو سرکش نہیں پاتا بلکہ ہر وقت ہر رنج و راحت پر صبر کرنے والا ہے تو وہی کامیاب اور مظفر و منصور ہو سکتا ہے وَاِلَّا وہ اپنے ایمان پر بھروسہ نہ کرے اس کا ایمان اسی وقت کام آ سکتا ہے جبکہ وہ ہر حالت میں خدا تعالیٰ کی مرضی پر راضی ہو اور اگر وہ اپنے ایمان پر بھروسہ کرے گا تو وہ ایمان ضرور اسے نامرادی کا منہ دکھائے گا۔ اس وقت تو ایمان لانے کیلئے خدا تعالیٰ نے بڑی آسانیاں کر دی ہیں اور جو دقتیں صحابہؓ کے وقت میں تھیں اب وہ نہیں اُس وقت تو ایمان لانے کے واسطے بڑی بڑی دقتوں اور مصیبتوں کو برداشت کرنا پڑتا تھا اور ایمان لانے پر تلوار چلتی تھی۔ اِس وقت نہ تو تلوار ہے اور نہ جانوں کی قربانی کرنی پڑتی ہے۔ صحابہؓ باوجود ان سب مشکلات اور مصائب کے ابتلاء کا نام نہیں لیتے تھے اور ایسے مصائب اور مشکلات کے ہوتے ہوئے بھی انہوں نے کبھی

خدا تعالیٰ کی شکایت نہیں کی۔ اور ان کو کبھی ایسی ایسی لغو باتوں پر ابتلاء نہیں آیا جیسا کہ اس وقت بعض لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ فلاں بات پر ہمیں ابتلاء آ گیا۔ چنانچہ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک شخص قادیان میں آیا کوئی شخص اس کے پاس دوڑتا ہوا گزرا تو اسے کُہنی لگ گئی اس بات پر اس کو ابتلاء آ گیا اور کہنے لگا۔ کیا حضرت مسیح موعودؑ کے ایسے ہی مرید ہیں۔ پھر بعض ایسے بھی ہوتے ہیں اگر ایک وقت روٹی نہ ملے یا جلی ہوئی مل جائے یا چارپائی ہی نہ ملے تو جھٹ ان کو ابتلاء آ جاتا ہے۔ ایسے لوگ ہر زمانہ میں ہوتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے وقت بھی ایسے انسان موجود تھے لیکن بہت ہی کم۔ چنانچہ ایک دفعہ ایک جنگلی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بیعت کی۔ کچھ دنوں بعد اسے بخار ہو گیا تو وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا یا رسول اللہ! میری بیعت واپس کر دیں کیونکہ مجھے تپ آ گیا ہے [۴]۔ مگر برخلاف اس کے ایسے ایسے بھی لوگ تھے جن کے قصے سن کر انسان کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ایک شخص کا ذکر احادیث میں آتا ہے۔ قرآن کریم میں بغیر نام [۵] کے اس کا ذکر آیا ہے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جب تبوک کو تشریف لے گئے تو تمام صحابہؓ نے جانے واسطے تیاری کی اور گھوڑے اونٹ تیار کئے لیکن اس شخص نے یہ خیال کیا کہ میں مالدار ہوں جب جانے کا وقت ہوگا تو جھٹ پٹ تمام تیاری کر لی جائے گی اور گھوڑے اونٹ وغیرہ خرید لئے جائیں گے اسی تیاری میں وہ دن آ گیا کہ آپ تبوک کو رخصت ہوئے تب اسے خیال آیا کہ جلدی کوئی انتظام کرنا چاہئیے کیونکہ آپ رخصت ہو گئے ہیں۔ مگر انتظام کرتے کرتے معلوم ہوا کہ آپؐ دور نکل گئے ہیں۔ پس جب اس نے دیکھا کہ اب آپ سے ملنا مشکل ہے تو ارادہ کر لیا کہ جب آپ واپس تشریف لائیں گے تو ایسی مشکلات بیان کروں گا جن کے سبب سے آپ مجھ کو معذور خیال فرما دیں گے۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں واپس تشریف لائے تو وہ سب لوگ جو مدینہ میں پیچھے رہ گئے تھے معذرت کیلئے آئے اور ہر ایک نے کوئی نہ کوئی معذوری اپنے متعلق بیان کر دی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان سب کیلئے دعا کی لیکن وہ شخص کہتا ہے کہ جس وقت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سامنے گیا تو وہ تمام عُذر جو میں نے دل میں گھڑے تھے دل کے دل ہی میں رہے اور کچھ بھی بیان نہ کر سکا۔ آخر مجھے کہنا پڑا یا رسول اللہ! مجھے میرے نفس نے دھوکا دیا تھا تو آپ نے اس کے واسطے دعا نہ کی۔ وہ کہتا ہے کہ جب میں آپ کے پاس سے اٹھا تو بعض لوگوں نے کہا کہ تو نے عُذر کیوں نہ کیا، دیکھا آپؐ تجھ سے ناراض ہو گئے۔ اس پر کہتا

ہے کہ مجھے خیال آیا کہ مَیں اب بھی جا کر عذر کروں لیکن میرے دل میں آیا کہ پوچھوں تو سہی کہ میرے سوا کسی اور نے بھی اپنی غلطی کا اقرار کیا ہے۔ جب پوچھا تو دو اور شخص معلوم ہوئے وہ کہتا ہے کہ صرف وہ دو ہی شخص مسلمان تھے باقی کو ہم جانتے تھے کہ منافق ہیں۔ پس میں نے منافقوں میں شامل ہونا نہ چاہا۔ ان تینوں کے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حکم دیا کہ کوئی ان سے کلام نہ کرے۔ پھر کچھ دنوں بعد بیویوں سے جُدا رہنے کا بھی حکم دے دیا۔ وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ میرا ایک چچا کا بیٹا تھا۔ ایک دن تنگ ہو کر مَیں اس کے پاس گیا اور کہا کہ تم خوب جانتے ہو کہ میرا کوئی قصور نہیں، صرف سستی کا یہ نتیجہ ہے۔ اس پر اس نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا اللہ اور اس کا رسول اچھی طرح جانتے ہیں اور اس کے سوا کوئی جواب نہ دیا۔ اس پر مَیں وہاں سے چلا آیا۔ راستہ میں ایک عیسائی بادشاہ کا خط کسی نے مجھے دیا جس میں لکھا تھا کہ سنا ہے کہ تیرے ساتھ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) نے بہت بُرا سلوک کیا ہے۔ ہمیں سن کر بہت افسوس ہوا ہے تُو بہت بڑا آدمی ہے تُو ہمارے پاس آ جا ہم تیری عزت کریں گے۔ مَیں نے سمجھا کہ یہ شیطان کا حربہ ہے جو ایلچی خط لے کر آیا تھا اس کے سامنے ہی خط کو پھاڑ کر آگ میں ڈال دیا اور اس کو کہا میری طرف سے یہی جواب ہے اس شخص اور اس کے ساتھیوں کی طرف یہ آیت اشارہ کرتی ہے وَضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ[1] کہ زمین باوجود فراخ ہونے کے ان پر تنگ ہو گئی۔ لیکن باوجود اس ابتلاء اور اتنی بڑی مصیبت کے اس شخص کو بھی کس قدر عشق تھا کہ اسکے دل پر ذرہ بھی میل نہیں آئی بلکہ اس کی محبت کا حال اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بیان کرتا ہے انہی ناراضگی کے ایام میں مَیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس جاتا اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ کہہ کر بیٹھ جاتا اور پھر آپ کے منہ کی طرف دیکھتا کہ کیا آپ سلام کا جواب دیتے ہیں یا نہیں جب آپ کا دہن مبارک ہلتا نہ دیکھتا تو خیال کرتا کہ شاید مَیں دیکھ نہیں سکا آپ نے اپنے منہ میں جواب دے دیا ہوگا اور اپنے دل کی تسلی کیلئے پھر اٹھ کر مجلس سے چلا جاتا اور پھر واپس آ کر سلام کہتا اور اسی طرح بار بار کرتا رہا ہے۔ یہ تو ایک مثال ہے صحابہ میں اس کی بہت نظیریں موجود ہیں۔ اگر وہ لوگ بھی ہماری طرح ہی ذرہ ذرہ سی باتوں کو ابتلاء خیال کرتے تو کیسے کامیاب ہوتے۔ غرض ان لوگوں نے اپنے وطن، دوست، بال بچے، عزیز و اقارب کو چھوڑا اور خدا کے قریب ہوئے۔ سچی دوستی اور محبت اور کامل ایمان کا پتہ مصیبت کے وقت ہی لگتا ہے۔ مصیبت کے وقت ساتھ دینے

والے ہی سچے دوست ہوتے ہیں۔آرام کے وقت میں تو ہر ایک دوست بن جاتا ہے۔

پس تمہیں بھی چاہئیے کہ ہر ابتلاء کے وقت تم دیکھو کہ آیا ہمارے ایمان تو ڈگمگا نہیں گئے اگر تمہارے ایمانوں کو ذرہ ذرہ مصیبتوں اور ابتلاؤں کے وقت میں پھسل جانے کا ڈر ہے تو تم خدا تعالیٰ سے تعلق بڑھاؤ اور اپنے ایمانوں کو کامل کرنے کی کوشش کرو۔کامل ایمان اسی شخص کا ہے جو ابتلاء اور مصیبت کے وقت اپنے ایمان میں ذرا جنبش نہیں دیکھتا۔سچے تعلق اور رشتہ کا پتہ تو اس وقت لگتا ہے جب کہ مصیبت آئے ورنہ آرام اور آسائش میں تو بدمعاش اور شریر بھی خدا تعالیٰ سے بڑی عقیدت اور تعلق ظاہر کرتے ہیں مگر ان کے تعلق اور محبت اور کامل ایمان کا تو اسی وقت پتہ لگتا ہے جبکہ مصیبت اور ابتلاء آئے۔اس آیت میں فرمایا کہ جس کا تعلق خدا تعالیٰ سے ایسا کمزور ہے وہ تو کھلے گھاٹے میں ہے۔وہ کبھی کامیاب اور مظفر و منصور نہیں ہوسکتا۔پس ہماری جماعت کو چاہئیے کہ اپنے اندر ایسا ایمان پیدا کریں اور ذرہ ذرہ سی باتوں پر ابتلاء کا لفظ استعمال نہ کیا کریں۔اگر روٹی نہ ملی تو کہہ دیا کہ ابتلاء آ گیا یا کوئی اور چھوٹی سی تکلیف آ گئی تو کہہ دیا ابتلاء آیا۔صحابہ رضی اللہ عنہم کے وقت میں تو تلوار چلتی تھی اور ابتلاء کا لفظ بھی زبان پر نہ لاتے تھے تم اپنے حوصلوں کو وسیع کرو۔ایسے کامل ایمان کے لوگ بھی خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہماری جماعت میں موجود ہیں جن سے بیویاں چھن گئیں، مکانات چھن گئے، عزتیں جاتی رہیں، بچوں کو سکولوں سے روک دیا گیا اور طرح طرح کی اذیتیں ان کو دی گئیں مگر انہوں نے کبھی ابتلاء کا لفظ استعمال نہیں کیا۔دیکھو شاہزادہ عبداللطیف صاحب کو کیسی تکالیف دی گئیں مگر انہوں نے کبھی اس بات کا اظہار نہیں کیا کہ مجھے ابتلاء پیش آیا ہے۔جو شخص شہزادہ عبداللطیف کے واقعات کو پیش نظر رکھے گا وہ ضرور فائدہ اٹھائے گا۔قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کے متعلق ابتلاء کا لفظ استعمال کیا ہے لیکن جانتے ہو وہ کیا ابتلاء تھا۔آپ کے ابتلاؤں میں سے ایک تو ظاہر ہے یہ تھا کہ ان کو حکم دیا گیا تھا کہ اپنے بچہ کو اپنے ہاتھ سے قتل کر دیں لیکن وہ بِلا کسی عُذر کے ایسا کرنے پر تیار ہو گئے آخر اللہ تعالیٰ کے بڑے بڑے انعامات کے وارث ہوئے۔

پس ذرا ذرا سی باتوں پر ابتلاء کا لفظ بولنا ایمان کی کمزوری کا ثبوت ہے۔بہت کم ہیں جنہیں ابتلاء آئے ہیں۔ابتلاء کوئی چھوٹا سا لفظ نہیں۔ابتلاء تو ایمان کی آزمائش کیلئے ہوتا ہے۔گورنمنٹ بھی اپنے خادموں کی لیاقت ظاہر کرنے کیلئے ان کا امتحان لیتی ہے۔ان ابتلاؤں سے

تو جن کو لوگ آج کل ابتلاء قرار دیتے ہیں ان امتحانوں کی سختی ہی زیادہ ہوتی ہے۔ پھر سمجھنا چاہئے کہ خدا تعالیٰ کا امتحان کیسا ہونا چاہئیے۔ اللہ تعالیٰ ہماری جماعت کو وہ ایمان دے جو بڑے سے بڑے ابتلاء میں بھی قائم رہنے والا ہو لیکن ساتھ ہی ہم کو ابتلاء سے محفوظ بھی رکھے کہ ہم کمزور انسان ہیں۔

جو لوگ جلسہ کے منتظم ہیں ان کی یہ خواہش ہے کہ مَیں پھر لوگوں کو جلسہ کے کام کیلئے توجہ دلاؤں اور مہمانوں سے اچھا سلوک کرنے کی ترغیب دوں۔ بعض لوگ اس بات کی چنداں پرواہ نہیں کرتے اور مہمانوں سے جیسا سلوک کرنا چاہئیے وہ نہیں کرتے۔ حضرت مسیح موعودؑ کے وقت میں بعض مہمانوں کو کھانے کی تکلیف ہوئی اور بعض لوگ میزبانوں کی بے توجہی سے بھوکے رہے۔ تو حضرتؑ کو یہ الہام ہوا یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ اَطْعِمُوا الْجَائِعَ وَالْمُعْتَرَّ ۸۔ پس تمہیں مہمانوں کی خاطر و تواضع اس طرح کرنی چاہئیے جیسا کہ تم چاہتے ہو کہ کوئی تمہاری خاطر کرے۔ کیا تم چاہتے ہو کہ تم کسی کے ہاں مہمان ہو جاؤ اور وہ تمہاری طرف توجہ بھی نہ کریں اور جب تمہارا سالن یا روٹی ختم ہو جائے تو وہ تمہیں کہہ دیں کہ اب سالن ختم ہو گیا ہے۔ پس ایسا نہ ہو کہ کوئی بات دریافت کریں تو ان کو خشک جواب دے دیا جائے۔ مثلاً اگر کوئی ناواقف شہر میں آ جائے اور اس کی جگہ باہر ہو تو اسے کہہ دیا جائے کہ آپ کی جگہ یہاں نہیں آپ وہاں جائیں اور وہاں جائے تو باہر والے کہہ دیں کہ فلاں جگہ چلے جائیں وہ بیچارہ حیران ہو کر ادھر ادھر چکر لگاتا رہے۔ پس ہر ایک کو چاہئیے خواہ وہ اس کا کام ہو یا نہ ہو اس کو واقف کراویں اگر خود نہ ساتھ جا سکیں تو کسی دوسرے کو اس کے ساتھ کر دیں جو ان کو جگہ بتلا دے۔ اگر کوئی غلطی ان سے ہو جائے تو بھی اپنی طرف ہی اسے منسوب کریں کیونکہ مہمانوں کا کام نہیں ہوتا کہ وہ تمہارے قواعد کو یاد کریں یہ قواعد صرف کارکنوں کی ہدایت کیلئے ہیں۔ بعض دفعہ دونوں جگہ مختلف کھانے پکنے سے بڑی ابتری پھیلتی ہے جو چیز یہاں پکے وہی چیز وہاں پکے ہر ایک تکلیف برداشت کر کے بھی انتظام کی عمدگی کی کوشش کرو۔ بہت دفعہ کام سے کلام اچھا ہوتا ہے اگر تم اچھے اخلاق اور سلوک سے پیش آؤ گے تو وہ تمہاری محبت اور اخلاق ان اعلیٰ اعلیٰ کھانوں سے بہتر ہے جن کے ساتھ ترش روئی اور بدسلوکی کا برتاؤ ہو۔

پس تم کام بھی اچھا کرو اور کلام بھی اور اپنا ظاہر و باطن دونوں یکساں رکھو۔ بعض لوگ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ جب ہم دل سے خدا کا نام لیتے ہیں تو منہ اور جسم ہلانے کی کیا

ضرورت ہے مگر یہ ان کی جہالت ہے۔ روح کو جسم سے تعلق ہوتا ہے۔ پس یہ مت خیال کرو کہ ہمارے دل میں ان مہمانوں کی عزت اور محبت ہے جو کچھ دل میں ہے اس کو ظاہر بھی کرو اور صحابہؓ کی طرح مہمانوں کی خاطر و تواضع کرو۔ ایک دفعہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ مہمان آ گئے تو ایک صحابی نے کہا یا رسول اللہ! ایک مہمان مجھے دے دیں مَیں اسے روٹی کھلاؤں گا۔ دوسرے نے کہا یا رسول اللہ! دو مہمان مجھے دے دیں۔ جس کے دو مہمان تھے اس کے گھر میں صرف دو ہی آدمیوں کا کھانا تھا اس نے بیوی سے کہا کہ بچوں کو سُلا دو اور کہہ دو کہ کھانا کھانے کے وقت تم کو جگا دیں گے بچے سو گئے بیوی سے کہا کہ مَیں تم سے کہوں گا کہ ذرا چراغ کی بتّی کو اور اونچا کر دو۔ تو تم نے اس طرز سے اونچا کرنا ہے کہ وہ بجھ جائے۔ خیر اس نے ایسا ہی کیا۔ چراغ بجھنے کے بعد انہوں نے مہمانوں کو کہا کہ آپ اندھیرے میں ہی کھالیں۔ دیا تو اب بجھ گیا ہے۔ مہمانوں نے کھانا شروع کیا تو یہ بھی اس طرز سے منہ ہلاتے رہے کہ گویا خود بھی کھا رہے ہیں۔ جب صبح ہوئی تو وہ شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ آپ مسکرائے اور ساتھ ہی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بھی تمہارے اس فعل پر ہنسا اور خوش ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے نبی کریمؐ کو بتلا دیا کہ میں اس شخص پر خوش ہوں [۹]۔

پس تم کو بھی چاہئیے کہ تم مہمانوں کی خدمت میں لگ جاؤ اور کسی قسم کی غفلت نہ کرو کیونکہ مہمان نوازی خدا تعالیٰ کی خوشی کا باعث ہوتی ہے بیشک مہمانداری ایک دوسری چیز ہے۔ اور اصل غرض تو دین کی اشاعت اور اتحاد جماعت ہے جس کیلئے جلسہ ہوتا ہے لیکن اگر مہمانوں کو تکلیف ہو تو وہ بے فکر ہو کر اس کام میں کیونکر شریک ہو سکتے ہیں جس کیلئے وہ یہاں آتے ہیں۔ پس گو وہ اس لئے یہاں نہیں آتے کہ ان کی خاطر کی جائے لیکن آپ لوگوں کی خدمت اصل غرض کے پورا کرنے میں بہت کچھ مدد دے سکتی ہے۔

(الفضل ۱۸۔ دسمبر ۱۹۱۵ء)

---

۱ الحج: ۱۲

۲ مہر منیر احمد فیض جامعہ غوثیہ گولڑہ صفحہ ۳۴۔

۳ مثنوی مولوی معنوی مولانا جلال الدین رومی دفتر دوم صفحہ ۱۵۱ تا ۱۵۳ ناشران اردو بازار لاہور مترجم قاضی سجاد حسین

۴۔ بخاری کتاب الاحکام باب من بایع ثم استقال البیعة
۵۔ حضرت کعب بن مالک (مرتب)
۶۔ التوبة:۱۱۸
۷۔ بخاری کتاب المغازی باب حدیث کعب بن مالك
۸۔ تذکرہ صفحہ ۷۴۶۔ایڈیشن چہارم
۹۔ بخاری کتاب التفسیر ۔تفسیر سورة الحشر باب قولهٗ ویؤثرون علیٰ انفسهم و مسلم کتاب الاشربة باب اکرام ضیف